احسان الٰہی ظہیر

سفرِ حجاز

واقعات و مشاہدات

○

پاکستان میں انتخابی گہما گہمی ختم ہو چکی تھی اور ہم اپنے بستر کھول چکے تھے۔ طبیعت پر ایک بوجھ تھا اور اعصاب میں تناؤ، نہ جانے انتخابی فسردگی تھی یا ان دلوں کی تگ و دو کی تھکاوٹ۔ اور دن گزرتے گئے لیکن فسردگی اور تھکاوٹ میں کمی کی بجائے اضافہ ہوتا گیا۔ اچانک ایک رات لیٹے لیٹے خیال آیا کہ اگر اس دفعہ حرمین کی زیارت نصیب ہو جائے تو سب کوفتیں دور اور کلفتیں کافور ہو جائیں۔ صبح ہوئی تو دل و دماغ پہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کا تصور چھایا ہوا تھا۔ ظاہری اسباب حوصلہ شکن اور ظروف و حالات روح فرسا تھے لیکن ہمہ گاہی کی دعا سے ایک گونہ سکون اور اطمینان تھا کہ مسبب الاسباب حالات و اسباب کو درست فرما دے گا۔ یہ جنوری کی تین تاریخ تھی کہ میں نے درسِ قرآن کے بعد احباب کو اس ارادہ سے باخبر کیا۔ درس کے ایک ساتھی اور دوست میر اکرم صاحب بھی تیار ہو گئے اور دوسرے دوست چوہدری صابر صاحب بھی، معلوم ہوا کہ امسال ہر پاسپورٹ رکھنے والے کو اجازت ہے کہ پی فارم منظور کروا کے کونسی حاصل کیے بغیر حج کے لیے چلا جائے، نہ جانے یہ کیا عجیب قانون ہے کہ ایک پاکستانی غیر ملک میں کونسی تو نہیں لے جا سکتا خود جا سکتا ہے؟۔ بہر حال پی فارم کے لیے پاسپورٹ طلب کیے تو پتہ چلا کہ میر اکرم صاحب کا پاسپورٹ ہی نہیں، حضور یہ کیا! کہا پاسپورٹ آج بننے کے لیے دے دیتے ہیں۔ خدا کا شکر کہ ایک ہفتہ کے اندر پاسپورٹ نے تمام مراحل طے کر لیے۔ بارہ کو پی فارم کے لیے پاسپورٹ سٹیٹ بنک میں دیے تو معلوم ہوا، درخواست دہندگان کی کثرت کی وجہ سے حکومت نے بارہ سے نئے

پی فارم کا اجرا بند کر دیا ہے، لیکن شوق غالب رہا اور پابندی مغلوب۔ اور جب پاسپورٹ ملے تو معلوم ہوا کہ میرے پاسپورٹ پر کوئی خامی ہے جس کی وجہ سے میرا پی فارم منظور نہیں ہو سکتا۔ متعلقہ آفیسر سے ملے تو بعد ردوقدح کے وہ آمادہ ہوئے، اتنی دیر میں پی آئی اے نے مزید ٹکٹیں دینی بند کر دیں اور اعلان کر دیا کہ اب کوئی جگہ نہیں رہی۔ پندرہ جنوری سے لے کر بیس جنوری تک ہر اس ایئر لائن کو ٹیلیفون کر دیکھے اور ان کے دروازے پر دستک دے دیکھی جن کے جہاز جدہ جاتے تھے۔ لیکن کسی نے سیٹ نہ دی۔ اب شوق نے اضطراب کا رنگ اختیار کر لیا۔ ابھی تمام کام باقی تھے۔ ٹیکے۔ ہیلتھ سرٹیفکیٹ ویزے اور دوسرے متعلقہ کام لیکن یہاں سیٹیں ہی نہیں مل رہیں۔ بیس جنوری بدھ کی شام کو جب مایوسی نے چاروں طرف سے ڈیرے ڈال دیے تو دونوں دوست میرے گھر آئے، چہرے اترے ہوئے رنگ بدلے ہوئے اور آنکھوں میں آنسو لیے، اب کیا ہو گا؟ اللہ مالک ہے میں نے جواب دیا۔

لیکن اب تو کسی ایئر لائن کا دروازہ باقی نہیں رہا جس پر ہم دستک نہیں دے سکے۔ میں نے پھر مسکراتے ہوئے کہا کہ کوئی نہیں پچھلے تمام واقعات سے تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ رب کریم ہمیں نوازنا چاہتا ہے اب بھی کوئی صورت نکل ہی آئے گی۔ ابھی میں نے اپنے فقرے کو مکمل نہیں کیا تھا کہ باہر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ دیکھا تو خلاف معمول شام کے جھٹ پٹے میں "ترجمان الحدیث" کے مینجر مولانا عبدالصمد کھڑے ہیں۔ پوچھا آپ آج اس وقت کیسے؟ جواب دیا آپ کا ایک رجسٹرڈ لفافہ آیا تھا۔ سوچا شاید ضروری ہو اسی وقت دے آؤں لفافہ دیکھا تو اوپر رابطہ عالم اسلامی کی مہر لگی ہوئی تھی۔ تعجب ہوا کہ یہ کہاں سے اور کیسے آگیا۔ کانپتے ہاتھوں اسے چاک کیا تو آنکھوں میں شکر کے آنسو اور لبوں پہ مسرت کا تبسم پھیل گیا۔

مکتوب رابطہ عالم اسلامی کے سیکرٹری جنرل شیخ محمد سرور الصبان کی طرف سے تھا جس میں اسی سال حج کے موقع پر سعودی عرب کے حکمران شاہ فیصل کی طرف سے ساتھیوں سمیت سعودی عرب کے دورے کی دعوت دی گئی تھی،

میں نے مسکراتے ہوئے میر اکرم صاحب اور چوہدری صابر کو حج کی مبارک باد دی، اور

انہیں تبلایا کہ شوق نے راہ کی تمام رکاوٹوں کو پھاند اور مراحل کو طے کر لیا ہے۔ چنانچہ فیصلہ ہوا کہ میں اسی وقت کراچی روانہ ہو جاؤں تاکہ ویزے اور سیٹوں کا بندوبست کیا جا سکے۔ اسی وقت مال روڈ پی آئی اے آفس پہنچے تو معلوم ہوا کہ ایک گھنٹہ بعد طیارہ کراچی جانے والا ہے لیکن اس میں کوئی سیٹ نہیں۔ ایک جانے والے نکل آئے اور انہوں نے کوشش کر کے فرسٹ کلاس میں سیٹ لے دی۔ گھر آکر بیگ سنبھالا اور کراچی جمعیت اہلحدیث کے امیر جناب ڈاکٹر الٰہی علوی صاحب کو اپنی آمد کی اطلاع دے دی۔ پونے گیارہ بجے رات طیارہ جب کراچی ہوائی اڈے پر اترا تو کراچی بھیگی ہوئی تھی اور بڑے دروازے پر کراچی جمعیت اہل حدیث کے جواں ہمت بوڑھے امیر ڈاکٹر علوی صاحب، مولانا عبدالغفور صاحب خطیب جامع اہل حدیث جہلم اور کئی ایک دوسرے دوستوں سمیت منتظر کھڑے تھے۔ گرم جوشی سے ملے اور میرے اصرار کے باوجود ہوٹل کی بجائے اپنی کوٹھی لے گئے اور اپنی پُر از معلومات اور دلچسپ باتوں سے رات گئے تک محفل کو سجائے رکھا۔

صبح ہوتے ہی سعودی سفارت خانے کا رخ کیا۔ وہاں کراچی جمعیت کے مخلص کارکن مولانا عبدالسلام بریلوی کی معیت میں ویزے اور سیٹوں وغیرہ کا بندوبست کیا۔ اتنی دیر میں مدینہ منورہ کے ایک دوست اور کراچی میڈیکل کالج کے آخری سال کے طالب علم جناب منصور نزھہ بھی میری آمد کا سنکر اپنے ایک اور ملکی دوست کے ساتھ کار لے کر آ گئے اور ڈاکٹر صاحب محترم اور میرا کرم صاحب کے بہنوئی صادق بٹ صاحب کے اصرار کے باوجود اپنی غریب الوطنی کے ہوتے ہوئے روایتی عرب مہمان نوازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کراچی کے ایک بڑے ہوٹل میں کھانا کھلایا۔ بقیہ دن ادھر ادھر گھومتے گزرا، اور مغرب کو ڈاکٹر صاحب محترم پھر لاہور واپسی کے لیے ہوائی اڈہ پر چھوڑنے کے لیے تشریف لائے۔

اکیس رات کو لاہور واپسی ہوئی۔ بائیس سے جانے کی تیاریاں شروع کیں تیاریاں کیا تھیں ایک اٹیچی کیس اور چار جوڑے کپڑوں کے۔ اٹھائیس جنوری جمعرات کو ۱۲ بجے جہاز کی کراچی روانگی کا وقت تھا۔ بے شمار احباب الوداعی دعاؤں سے رخصت کرنے کے لیے ہوائی اڈہ پر موجود تھے، اور اس دن پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ دوست کس قدر محبت

اور پیار کے جذبات رکھتے ہیں۔ ۱/۲ ۱۲ بجے کراچی پہنچے۔ ہوائی اڈے پر صادق بٹ صاحب اور ان کے دیگر عزیز رشتہ دار اور احباب موجود تھے اور ان کا اصرار تھا کہ ہم کراچی میں ایک دن ان کے ہاں ہی قیام کریں لیکن ہم نے انکے ہاں کھانے کی دعوت تو قبول کرلی، قیام کے لیے ہوٹل ہی مناسب خیال کیا۔ اور اب جو ہوٹل کی تلاش میں نکلے تو معلوم ہوا کہ کراچی کے کسی اچھے ہوٹل میں کوئی کمرہ خالی نہیں۔ حاجیوں کے بے حد ہجوم کی وجہ سے تمام اچھے ہوٹل پہلے ہی بھر چکے تھے۔ اب ہم تھے اور کراچی کی سڑکیں۔ پہلے تو ٹیلیفون پر معلوم کرتے رہے۔ آخر مایوس ہوکر خود خوشنود بھائی (کراچی کے ایک دوست) کی گاڑی میں سڑکیں ناپنا شروع کیں۔ جبیں ہوٹل سے لے کر کانٹی نینٹل تک چھان مارے، کوئی جگہ نہیں، بڑے بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے۔ میر اکرم صاحب کی ہمشیرگان (جو کراچی میں ہی اقامت گزیں ہیں) کو پہلے انکار کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر علوی صاحب کے اصرار کے باوجود انہیں بھی معذرت کردی اور ایک دو دوستوں کو بھی شکریہ سے ٹال دیا۔ اب جائیں تو کہاں جائیں۔ گھومتے گھماتے کلفٹن کے ویرانے میں ایک انگریزی ہوٹل کو لیبس میں کامیابی کی صورت نظر آئی۔ تین آدمیوں کا کمرہ اور ایک رات کا کرایہ ۱۲۵ روپے بغیر کسی دوسری چیز کے، مرتے کیا نہ کرتے۔ کمرے کی ریزرویشن کا کر صادق بٹ صاحب کے گھر آئے۔ انتہائی پرتکلف کھانا کھایا اور سونے کے کپڑے لیے اور ہوٹل کی جانب چل دیے۔ جب ہوٹل پہنچے تو معلوم ہوا کہ مینیجر صاحب بہادر نے چند لمحے ہمارے انتظار کے بعد کمرہ کسی اور کو دے دیا ہے۔ بڑے سٹ پٹائے آخر بش اس کی منت سماجت پر معلوم ہوا کہ اوپر والی منزل میں ایک دو بستر اور ایک ایک بستر والا کمرہ موجود ہے۔ بڑے کمرے کا کرایہ ۱۲۵ اور چھوٹے کا ۷۵ روپے ہے۔ زندگی میں پہلی مرتبہ محسوس ہوا کہ کراچی میں شب بسری کتنی گراں اور مہنگی ہے، اتنے ظہر اور عصر کی اکٹھی نمازیں پڑھ کر سوئے تو مغرب کی اذان کے وقت ہی آنکھ کھلی۔ ڈاکٹر الٰہی علوی صاحب نے فون کیا۔ کراچی میں گھومنا پھرنا ہے یا کوئی کام وغیرہ ہو گا اس لئے میں گاڑی بھجوا دیتا ہوں۔ ان کے اخلاص اور محبت کا شکریہ ادا کیا اور بتلایا کہ آج تو خوشنود صاحب سے پروگرام طے ہے۔ آپ گاڑی صبح بھجوا دیجئے گا۔ اتنی دیر میں خوشنود صاحب آگئے

ان کے ساتھ رات گئے تک کراچی کے مختلف دوست احباب کو ملتے رہے۔ واپس آئے تو ایک اور مصیبت منتظر تھی۔ منیجر صاحب فرمانے لگے کہ آپ کرایہ پیشگی دے دیں ہم نے کہا کہ یہ تو اصول کے خلاف ہے اور اس وقت ہم بیگ وغیرہ بھی اپنے پاس نہیں رکھتے۔ کیونکہ سامان ہم بٹ صاحب کے ہاں ہی چھوڑ آئے تھے۔ منیجر صاحب اکڑ گئے۔ بہت میں اس وقت ایک سو اور کچھ روپے تھے وہ انہیں دیے لیکن ان کا اصرار جاری رہا کہ پورا کرایہ انہیں پہلے ہی ادا کریں۔ غصہ تو بڑا آیا لیکن صبر کر کے پوچھا کہ آخر اس کی وجہ کیا ہے تو معلوم ہوا کہ منیجر بے چارہ کچھ تو میرے سانتھیوں میر صاحب اور چوہدری صاحب کے ڈیل ڈول اور پنجابی جسم کو دیکھ کر ڈر گیا ہے اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ ہم بے سامان ٹھہرے ہوئے ہیں اور اسے کیا معلوم کہ ہم سیر کے بہانے جائیں اور پھر واپس نہ آئیں۔ بڑی مشکل سے اسے سمجھایا بارے اسے یقین آیا۔ اب ایک اور مصیبت کھڑی تھی۔ رات کافی گزر جانے کی وجہ سے کچھ بھوک محسوس ہوتی۔ بہرے کو بلا کر آرڈر دیا۔ بہرے نے تب تک تعمیل سے انکار کر دیا جب تک بل اسے پیشگی نہیں دیا جاتا جیب میں جو کچھ تھا وہ پہلے منیجر کو دے چکے تھے اب روڈھائی روپے سے زیادہ پاس کچھ نہ تھا۔ چنانچہ اس رات کو لمس میں تین پناہ گزینوں نے دو روپے کے سوکھے آلو کھا کر اور پانی کے گلاس پی کر ہی گزارا کیا۔ صبح جمعہ تھا۔ دن بھر کراچی کے قابل دید مقامات دیکھتے رہے۔ شام ہوئی ہوٹل سے احرام کے لیے غسل وغیرہ کیا۔ بدل دیا اور بٹ صاحب کے ہاں سے احرام کی چادریں باندھیں اور میر صاحب کے رشتہ داروں اور کراچی کے دوستوں کی معیت میں کراچی ایئرپورٹ کی طرف روانہ ہوئے۔ ساڑھے سات بجے وہاں پہنچے، پورٹ پر ہر طرف لوگوں کا اژدحام تھا۔ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ بے شمار لوگ احرام پہنے ادھر ادھر ٹہل رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ آج کئی کمپنیوں کے ہوائی جہاز جدہ جا رہے ہیں، جس کی وجہ سے اس قدر ہجوم ہے۔ ہم نے وہیں مغرب اور عشاء کی نماز جمع کر کے ادا کی اور سعودی ایئر لائن کے کاؤنٹر پر پہنچے۔ ٹکٹیں پیش کیں تو جواب ملا اس جہاز پر آپ کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے، کیوں؟ اس لیے کہ جہاز میں سیٹیں کم ہیں اور لمبی سے مسافر

زیادہ آگئے ہیں۔ اس لیے پاکستان سے کم مسافروں کو اس فلائٹ سے بھیجا جائے گا۔ آپ دوسری فلائٹ کا انتظار کریں۔ دوسری فلائٹ کب چلے گی؟ تین فروری کو جواب ملا۔ اور اگر اس میں بھی جگہ نہ ہو تو؟ جلدی سے میر اکرم نے سوال کیا۔ پھر ہم کیا کر سکتے ہیں جواب ملا اور یہ آخری پرواز تھی کیوں کہ پانچ کو حج تھا۔ افسوس ہماری قسمت ہی ایسی ہے، چوہدری صابر نے بے ساختہ کہا۔

میں نے ساتھیوں کو اطمینان دلایا کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ اوپر گیلری پر نگاہ گئی تو دیکھا میر صاحب کی بہنوں نے رو رو کر برا حال کر لیا ہے۔ میں نے ان سے رونے کی بجائے دعا کرنے کو کہا اور خود منیجر سے ملاقات کر کے اسے بتلایا کہ ہم اس طرح سعودی حکومت کی دعوت پر جا رہے ہیں۔ اس لیے ضرور کوئی بندوبست کیا جائے۔ ابھی یہ بات کر ہی رہا تھا کہ مسافروں اور ان کے ساتھیوں کے ایک ہجوم نے سعودی ایئر لائن کے کاؤنٹر پر ہلہ بول دیا۔ کاغذات پھاڑ دیے اور لسٹیں اٹھا کر لے گئے۔ یہ وہی لوگ تھے جن کی سیٹیں بک ہو چکی تھیں اور عین وقت پر انہیں اطلاع دی گئی کہ جہاز میں جگہ نہیں۔ ان مسافروں کی تعداد سو کے لگ بھگ تھی۔ مجھے حیرانگی ہے کہ سعودی ایئر لائن کی کراچی انتظامیہ نے کس طرح اس قدر غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا کہ پہلے سے اندازہ کیے بغیر اتنے مسافروں کو اس پرواز کے لیے ٹکٹ تو جاری کر دیے جبکہ جہاز بمبئی ہی سے بھر کر آ رہا تھا۔ بہر حال تین گھنٹے تک وہ ہا ہا کار مچی کہ پناہ بخدا۔ انتظامیہ بے بس تھی کہ جہاز بہر حال جہاز ہے۔ اونی بس تو نہیں کہ دس مسافروں کو ہٹا کر اور بیس کو کھڑا کر کے پرواز کر جائے اور مسافر بھی حق بجانب تھے کہ احرام باندھ کر اور گھروں سے الوداع ہو کر آ چکے ہیں۔ اب واپس کیسے جائیں۔ آخر ایئر پورٹ کی سیکورٹی فورس کو بلایا گیا اور ہنگامہ کچھ فرو ہوا۔ لیکن معاملہ جوں کا توں پیچیدہ تھا لوگ مصر تھے کہ جب تک انہیں سیٹیں نہیں ملتیں تب تک وہ جہاز کو پرواز نہیں کرنے دیں گے۔ اسی ہنگامہ میں کاؤنٹر منیجر میرے پاس آئے اور مجھے الگ لے جا کر کہنے لگے۔ آپ خوش قسمت ہیں کہ بمبئی سے تین مسافر کم آئے ہیں اور جہاز میں تین سیٹیں خالی ہیں۔ آپ فوری طور پر اپنے سامان کو پچھلی جانب سے لے آئیں تاکہ آپ تو روانہ ہوں باقی ہم پھر دیکھ لیں

گئے۔ ہم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کی رحمت قدم قدم پہ ساتھ رہی۔ بہنوں کو خبر دی۔ ان کے پژمردہ چہروں کی رونق لوٹ آئی اور ہم جہاز پر سوار ہو گئے، ایک دفعہ پھر بھگدڑ مچی۔ اعلان ہوا کہ سب مسافر اتر جائیں۔ معلوم کیا تو پتہ چلا کہ کسی نے خبر دی ہے کہ جہاز میں بم رکھ دیا گیا ہے اور گھنٹہ بھر کی مکمل تفتیش سے معلوم ہوا کہ رہ جانے والے مسافروں میں سے کسی نے ویسے ہی پریشان کرنے کے لیے ٹیلیفون کر دیا تھا۔ ورنہ حقیقت کچھ نہ تھی آخر خدا خدا کر کے سوا آٹھ بجے روانہ ہونے والا جہاز رات ساڑھے گیارہ بجے کراچی پورٹ سے حرکت میں آیا۔ جہاز کے فضا میں بلند ہونے کے تھوڑی دیر بعد ہی ہم نے احرام کی نیت کر کے تلبیہ پکارنا شروع کیا اور پورا جہاز جس میں تقریباً سبھی بیت الحرام کے مسافر تھے لبیک اللھم لبیک لبیک لا شریک لک لبیک ان الحمد والنعمۃ لک والملک لا شریک لک کی خوشبو سے مہک گیا۔ رات کی تاریکی۔ فضا کی خنکی اور زمین سے ۳۲ ہزار فٹ کی بلندی۔ مسافر بیت الحرام کے اور لبوں پہ نغمۂ توحید پوری کائنات وجد کرتی نظر آئی۔ ساڑھے تین بجے رات ہم سعودی عرب کے بین الاقوامی ہوائی اڈے ظہران میں اتر رہے تھے۔ تمام مسافروں کو اپنے اپنے پاسپورٹ اور ہیلتھ سرٹیفکیٹ اور دستی سامان ہینڈ بیگ اور دوسرا ہلکا سامان جو مسافر اپنے پاس ہی رکھتے ہیں، لے کر نیچے اترنے کو کہا گیا، نیچے اتر کر معلوم ہوا کہ یہاں پاسپورٹ، ہیلتھ سرٹیفکیٹ اور دستی سامان اس لیے چیک کیا جاتا ہے، تاکہ جدہ پورٹ پر حج کے ایام کا بے پناہ دباؤ کم کیا جا سکے۔ تقریباً ایک گھنٹہ پاسپورٹ اور ہیلتھ سرٹیفکیٹ چیک کرنے میں صرف ہوا کیونکہ ہم سے پہلے تین اور جہازوں کے مسافروں کی پڑتال ابھی باقی تھی۔ بہرحال وہاں سے فارغ ہو کر ہم کسٹم ہاؤس پہنچے ہم نے روانگی سے پہلے دوستوں کو تحفہ دینے کے لیے کچھ چلغوزے اور پاکستانی مٹھائیاں خرید کر ایک تھیلے میں بند کر لی تھیں اور تھیلے کو سی لیا تھا۔ کسٹم آفیسر نے تھیلے کو کھولنے کا حکم دیا۔ ہمیں اعتراض نہ تھا لیکن پھر تھیلے کو سینا ناممکن تھا اور آفیسر پاکستان کے جھنگ چرس کی شہرت کی بنا پر اسے بغیر کھولے چھوڑنے پر آمادہ نہ تھا آخر مجھے خیال آیا اور میں نے اسے رابطہ کا وہ مکتوب دکھایا جس میں شاہ کے حکم پر ہمیں سعودی عرب

آنے کی دعوت دی گئی تھی۔ کسٹم آفیسر نے خط دیکھا اور اچانک ہی اس کے چہرے پر ندامت کے آثار نمودار ہوئے، مجھے معاف کر دیجئے۔ آپ نے پہلے کیوں نہیں بتلایا کہ آپ سرکاری مہمان ہیں اور پھر بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور دور تک رخصت کرنے آیا وہاں سے ہم اپنا اسباب اٹھا کر انتظار گاہ میں آ گئے۔ یہ انتظار گاہ اور ایئر پورٹ کی ساری عمارت پورے مشرق وسطیٰ میں خوبصورتی، نفاست اور عمدگی میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ اس ہوائی اڈے کو دیکھ کر یہ یقین ہی نہیں آتا کہ ہم مشرق وسطیٰ کے کسی ملک میں نہیں۔ اسے دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ سعودی عرب کس تیزی سے ترقی کی بلندیوں کی جانب رواں دواں ہے۔ تقریباً دو گھنٹے یہاں ٹھہر کر جہاز جدہ کے لیے روانہ ہوا۔ جہاز میں ایک قابل ذکر تبدیلی یہ آئی کہ پہلے خدمت گار لڑکیاں انگریز تھیں۔ اور ظہران سے عرب عیسائی لڑکیوں نے ان کی جگہ لے لی جو لبنان اور شام سے تعلق رکھتی تھیں۔ جہازوں میں یہ ایک عجیب رد و چل نکلی ہے کہ خدمت کے لیے لڑکیوں کو منتخب کیا جاتا ہے حالانکہ یہ کام مرد زیادہ بہتر طریق سے انجام دے سکتے ہیں۔ بہرحال پانچ بجے کے قریب ظہران سے روانہ ہو کر پاکستانی وقت کے مطابق سوا چھ بجے رات جہاز جدہ کے عظیم ترین رن وے پر دوڑ رہا تھا۔ منزل کو اس قدر قریب پا کر مسافروں کے اس غیر معمولی طویل سفر (عام حالات میں کراچی سے جدہ تک سفر میں سوا تین گھنٹے صرف ہوتے ہیں) کی تھکان دور ہو چکی تھی۔ جہاز رکتے ہی اونگھتے ہوئے مسافر سنبھل گئے اور تلبیہ تکبیر پکارنے لگے، سیڑھی لگائی گئی اور مسافر نیچے اترنے لگے ابھی میں نے رن پر قدم رکھا ہی تھا کہ خالص عربی لباس عباد قبا میں ملبوس تین آدمی آگے بڑھے۔ ہاتھوں میں کچھ کاغذات تھے۔ ان میں ایک نے جھکتے ہوئے انگریزی میں پوچھا آپ احسان الٰہی ظہیر تو نہیں؟ جی ہاں میں نے عربی میں جواب دیا تپاک سے ملے مصافحہ کیا اور پھر معانقہ۔ اور کہا کہ ہم رابطہ عالم اسلامی کی طرف سے آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں اور ساتھ ہی سیڑھی سے لگی کھڑی ایک بڑی شیورلیٹ ایمبسڈر گاڑی میں ہم کو بٹھا دیا ان میں سے ایک تو ہمارے ساتھ ہی بیٹھ گئے اور دوسرے ہم سے پاسپورٹ اور سامان

کے کارڈ (ٹیکٹ) لے کر چلے گئے اور کہہ گئے کہ سامان صبح ہوٹل میں پہنچ جائے گا اور پھر بغیر کسی قسم کی تفتیش و تحقیق کے ہوائی اڈے کی عمارت میں داخل ہوئے۔ پھر ان دے سے ہی لے کر ہوٹل روانہ ہو گئے۔ فندق الیشیا جدہ کے فرسٹ کلاس ہوٹلوں میں سے ایک ہے۔ بارہ منزلہ خوبصورت عمارت اور شہر کی بارونق شاہراہ۔ شارع ملک عبدالعزیز پر واقع۔ ہمارے لیے ساتویں منزل پر ایک خوبصورت آراستہ و پیراستہ کمرہ پہلے ہی سے ریزرو تھا۔ وضو کیا اور اذان فجر کے انتظار میں بیٹھ گئے کہ نماز پڑھ کر ہی سوئیں گے۔ میر صاحب اور چوہدری صاحب بڑے حیران تھے کہ آج رات ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہی۔ میں نے انہیں بتلایا کہ مشرق سے مغرب کی جانب سفر کرتے ہوئے دن اور رات بڑھ جاتے اور مغرب سے مشرق کی طرف سفر کرتے ہوئے دن اور رات چھوٹے ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ پاکستانی وقت کے مطابق تقریباً ساڑھے آٹھ اور سعودی وقت کے مطابق تقریباً چھ بجے اور سکی وقت کے مطابق تقریباً ساڑھے دس بجے صبح فجر کی اذان ہوئی۔ ہم نے ہوٹل ہی میں نماز فجر ادا کی۔ گھڑیاں سعودی ٹائم کے مطابق کر لیں اور لمبی تان کر سو گئے صبح گیارہ بجے رابطہ کے مندوب نے آ کر جگایا۔ بیدار ہو کر احرام کو سنبھالا۔ چادروں کو درست کیا اور مندوب رابطہ کے ساتھ شہر کی سیر کو نکل گئے۔ جدہ میرا دیکھا بھالا شہر چار سال کے بعد پھر ایک دفعہ خوبی تقدیر اس شہر میں لے آئی۔ اس شہر کا کوئی کوچہ کوئی گلی اور کوئی بازار ایسا نہیں جو مجھے نہ جانتے ہوں یا جنہیں میں نہ جانتا ہوں۔ وہی آشنا چہرے۔ وہی مانوس بولی ٹھولی خیال تھا کہ چار سال بعد ابتدائی طور پر کچھ اجنبیت محسوس ہو گی لیکن جدہ پہنچ کر ایسا معلوم ہوا کہ یہاں سے کبھی گیا ہی نہیں۔ ہمیشہ سے یہیں ہوں۔ ہر چیز وہی۔ جدہ سے ایک خصوصی تعلق رہا ہے اس لیے کہ جدہ سعودی عرب کی بین الاقوامی پورٹ ہونے کے علاوہ مکہ اور مدینہ کی درمیانی منزل بھی ہے اور ہم وطن آتے اور مکہ مکرمہ جاتے ہوئے کئی کئی دن جدہ قیام ——— اور شہر گردی کیا کرتے تھے۔ جدہ ساحل سمندر پر واقع ہے اور آب و ہوا کے لحاظ سے بالکل کراچی کی مانند ——— وہی گرمی اور سردی اور ہوا میں نمی۔ یہ حجاز کا سب سے بڑا شہر اور سعودی عرب کا حقیقی دارالخلافہ ہے۔ اسما اور سما

ریاض کو دارالحکومت کہا جاتا ہے۔ لیکن تمام غیر ملکی سفارت خانے اور ایجنسیاں یہیں پر واقع ہیں اور بادشاہ بھی سال کا بیشتر حصہ یہیں گزارتے ہیں۔ جدہ بہت بڑی بندرگاہ بھی ہے لیکن اس کا سمندر اس قدر خوبصورت نہیں جس قدر کراچی کا سمندر اور ساحل خوبصورت ہے۔ اس شہر کا بیرونی علاقہ بالکل جدید طرز پر تعمیر شدہ ہے۔ ایسا ہی دکھائی دیتا ہے جیسے ہم مشرق کی بجائے مغرب کے کسی ملک میں ہیں۔ لیکن اندرون شہر بلند و بالا بارہ بارہ چودہ چودہ منزلوں کے پہلو بہ پہلو ترکی دور کی تعمیر کردہ چھوٹی اینٹ کی عمارتیں بھی کافی تعداد میں قدامت اور دیرانگاس کی نشاندہی کرتی ہیں۔ اگرچہ ان کو بھی تیزی سے گرا کر نئی بنیادوں پر استوار کرنے کی کوششیں جاری ہیں پھر بھی سیاح کو پرانے آثار مل ہی جاتے ہیں جدہ میں آکر ایک چیز فوری طور پر محسوس ہوتی ہے کہ گویا فقیری نام کی کوئی چیز اس دنیا میں ہے ہی نہیں جدھر نگاہ اٹھتی ہے دولت کے انبار کے انبار لگے نظر آتے ہیں۔ دکانیں ہر قسم کی دکانیں مال و منال سے بھری ہوئی ہیں۔ سب لوگ کاروں میں گھومتے پھرتے ہیں کاریں اس قدر ہیں کہ کوئی اندازہ ہی نہیں۔ اکاڈین، شیورلیٹ، اسپالاٹ، مرسیڈیس، کیڈلک، بیوک، رولز رائس، امپریل اور نہ جانے کس کس صورت اور رنگ، روپ کی کاریں۔ کاروں کا ایک سیلاب امڈا ہوا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دیس میں کوئی شخص بھی کار کے بغیر نہیں اور پھر اس بے پناہ دولت کے باوجود ہر چہرے پر ایک اطمینان ہے اور ایک آسودگی۔ کسی کو لٹ جانے کا ڈر ہے نہ پٹ جانے کا۔ ہم نے بازاروں میں اس طرح سونے اور چاندی کے ڈھیر لگے دیکھے جس طرح ہمارے ہاں امرود اور مالٹوں کے ڈھیر لگے ہوتے ہیں لیکن کوئی کسی کی طرف نگاہ اٹھا کے دیکھنے والا نہیں۔ قانونِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حکمرانی نے ہر شخص کو بے خوف بنا رکھا ہے۔ کسی کو کوئی دھڑکا نہیں

یہاں ایک سابقہ واقعہ کا ذکر بے جا نہ ہوگا کہ میں ۱۹۶۳ء کے آخر میں جب پہلی مرتبہ سعودی عرب گیا تو وہاں کے امن و امان کے قصے سن رکھے تھے لیکن یقین نہ آتا تھا۔ بغداد سے جہاز نے اڑان لی اور بصرہ میں اس کے اندر کوئی خرابی واقع ہوگئی۔ دیر تک اس کے نقص کو دور کیا جاتا رہا۔ آخر، رات گئے جہاز ٹھیک ہوا اور نصف رات گزر چکی تھی۔ کہ جہاز نے

جدہ ایئرپورٹ پر اپنے قدم ٹکائے۔ میرے پاس ٹریولنگ چیک تھے۔ میں نے پورٹ پر اترتے ہی پوچھا کہ چیک کہاں سے بھنائے جا سکیں گے۔ ایک تلی نے بتلایا۔ پورٹ کے باہر بغل میں چینجرز کی دکانیں ہیں۔ وہاں سے کرنسی تبدیل کی جا سکتی ہے۔ باہر آیا تو سڑک سنسان ہو چکی تھی۔ حج کے ایام نہ ہونے کی وجہ سے سڑک پر کوئی راہی چلتا نظر نہ آیا۔ اس جہاز کے مسافر ٹیکسی کاروں میں اپنی اپنی منزلوں کا رخ کر رہے تھے۔ اس تاریکی اور سناٹے میں مجھے دور ایک جگہ بلب کی روشنی نظر آئی۔ معلوم ہوا کہ وہی صراف (عربی میں چینجر کو صراف کہتے ہیں) کی دکان ہے۔ قریب پہنچا تو جہاں سونے چاندی اور سٹرلنگ پونڈوں اور امریکی ڈالروں اور ملک ملک کے سکوں کے ڈھیر سے آنکھیں ـــــ چکا چوند ہو گئیں۔ وہیں تعجب اور حیرانگی اور خوف کے ملے جلے جذبات سے سردی کی ایک لہر بھی جسم میں رینگتی محسوس ہوئی، رات کی تاریکی، پُرہول سناٹا اور تنہائی اور مال و دولت کے انبار اور صرف ایک نحیف نزار بقول شخصے مریل مالک تن تنہا اس اطمینان و سکون سے بیٹھا اونگھ رہا ہے جیسے اس کے سامنے روپے پیسے کے ڈھیر نہیں بلکہ ریوڑیاں اور مونگ پھلی پڑی ہے۔ مجھے قریب پاکر اور ٹکٹکی باندھے دیکھ کر وہ چونک پڑا اور ٹوٹی پھوٹی اردو میں بولا کیا بات ہے۔ میں نے عربی میں جواب دیا۔ بات تو کچھ نہیں۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ سونے چاندی کے یہ انبار اور رات کی یہ تنہائی۔ دور دور نزدیک کوئی نگران اور پاسبان نظر نہیں آتا جب کہ ہمارے ہاں محفوظ عمارتوں میں واقع بنکوں کے گیٹ بھی اس وقت تک نہیں کھلتے جب تک گن بردار محافظ دروازہ پر نہ ڈٹ جائے باوجود یکہ روپیہ اندرونی کمروں کے محفوظ لاکرز میں بند پڑا ہوتا ہے۔

وہ مسکرایا اور اس نے دھیرے سے جواب دیا۔ اجنبی جوان! تمہیں نگہبانوں اور نگرانوں کی ضرورت اس لیے پڑتی ہے کہ اللہ کو نگران ماننے کے لیے تیار نہیں وگرنہ جہاں قانون محمدؐ رائج کر دیا جائے وہاں کا نگہبان خود خدا ہو جاتا ہے اور پھر ہم نے اپنے چار سالہ طویل دورِ اقامت میں اس کو خوب خوب آزمایا۔

بہرحال یہ سارا دن جدہ میں گزرا۔ دوپہر کا کھانا ہوٹل میں کھایا۔ میرے لیے تو کھانا کچھ

ایسا نامانوس نہ تھا لیکن میرے ساتھیوں کے حلق سے اس عربی کھانے کا اترنا خاصا دشوار ہو رہا تھا

عصر کے بعد رابطہ عالم اسلامی کے ڈائرکٹر شیخ حسین سراج — رابطہ کے سکرٹری جنرل کی طرف سے ہمیں خوش آمدید کہنے کے لیے ہوٹل میں تشریف لائے اور دیر تک مختلف عالمی اور اسلامی مسائل پر گفتگو کرتے رہے اور آخر میں سعودی عرب میں پورے عرصہ قیام کے دوران ہر قسم کی سہولتیں فراہم کرنے کا یقین دلایا۔ اور رات جس گاڑی میں ایئرپورٹ سے — ہوٹل منتقل کیا تھا۔ اس کے ڈرائیور کو حکم دیا کہ وہ دوران قیام ہمارے ساتھ رہے۔

ہم نے ان کی تشریف آوری مہمان نوازی پر ان کا شکریہ ادا کیا اور مکہ مکرمہ روانہ ہونے کی تیاریاں کرنے لگے۔

قارئین "ترجمان الحدیث" کے لیے

خوش خبری

ترجمان کی مجلس مشاورت کے رکن اور برصغیر کے مشہور اور ممتاز اہل علم اور اہل قلم شیخ التفسیر حضرت مولانا محمد عبدہٗ صاحب نے "ترجمان الحدیث" کے لیے مستقلاً ایک نئے اسلوب سے تفسیر قرآن لکھنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ اگلے شمارہ سے مولانا پروفیسر ساجد میر صاحب ایم اے کے درس حدیث کے ساتھ ساتھ مولانا محمد عبدہٗ صاحب کا درس قرآن بھی ملاحظہ فرمایئے۔ (ادارہ)